﴿۳﴾ وَ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: اِنْطَلَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَ اَصْحَابُہٗ حَتّٰی سَبَقُوا الْمُشْرِکِیْنَ اِلٰی بَدْرٍ وَ جَآءَ الْمُشْرِکُوْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ قُوْمُوْا اِلَی الْجَنَّۃِ عَرْضُھَا السَّمٰوٰاتُ وَالْاَرْضُ قَالَ عُمَیْرُ بْنُ الْحُمَامِؓ بَخٍ بَخٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَا یَحْمِلُکَ عَلٰی قَوْلِکَ بَخٍ بَخٍ؟ قَالَ لاَ وَاللّٰہِ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِلّاَ رِجَاءَ اَنْ اَکُوْنَ مِنْ اَھْلِھَا قَالَ: فَاِنَّکَ مِنْ اَھْلِھَا قَالَ فَاَخْرَجَ تَمَرَاتٍ مِّنْ قَرَنِہٖ فَجَعَلَ یَاْکُلُ مِنْھُنَّ ثُمَّ قَالَ: لَئِنْ اَنَا حُیِیْتُ حَتّٰی اٰکُلَ تَمَرَاتِیْ اِنَّھَا لَحَیٰوۃٌ طَوِیْلَۃٌ قَالَ: فَرَمٰی بِمَا کَانَ مَعَہٗ مِنَ التَّمَرِ ثُمَّ قَاتَلَھُمْ حَتّٰی قُتِلَ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ (جنگ کے لیے) نکلے یہاں تک کہ وہ بدر میں مشرکوں سے پہلے جا پہنچے۔ پھر مشرک لوگ بھی آگئے۔ تو آپؐ نے (اپنے ساتھیوں سے) فرمایا: اس جنت کے لیے کھڑے ہوجاؤ جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کے مانند ہے۔ عمیر بن حمام بولے: خوب، خوب! آپؐ نے فرمایا: تم نے یہ الفاظ کیوں کہے۔ انھوں نے عرض کیا: بخدا یا رسول اللہ! صرف اس امید و آرزو میں کہ شاید اہل جنت میں میں بھی ہوجاؤں۔ آپؐ نے فرمایا: تم انھیں اہل جنت میں سے ہو۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد عمیر بن حمامؓ نے اپنے ترکش سے کچھ کھجوریں نکالیں اور انھیں کھانے لگے۔ پھر بولے: اگر میں اتنی دیر تک زندہ رہا کہ اپنی کھجوروں کو کھالوں تو یہ تو طویل زندگی ہوگی۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ کہہ کر جو کھجوریں ان کے پاس تھیں پھینک دیں اور مشرکوں سے لڑنے لگے یہاں تک کہ شہید ہوگئے۔

تشریح: یہ جنگ بدر کے موقع کی بات ہے۔ جنگ بدر شعبان ۲ھ میں ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی فوج ۳۱۹ مجاہدوں پر مشتمل تھی۔ مقابلہ میں ایک ہزار کی فوج تھی۔ مسلمانوں کے پاس لڑائی کا سامان بھی ٹھیک طور سے نہ تھا۔ حضور ﷺ کو صورتِ حال کی نزاکت کا پورا احساس تھا۔ آپؐ نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے اور بلند آواز سے فرمانے لگے: اَللّٰھُمَّ اَنْجِزْ لِیْ مَا وَعَدْتَّنِیْ اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃَ اَھْلِ الْاِسْلَامِ لاَ تُعْبَدُ فِی الْاَرْضِ ”خدایا! تو نے جو وعدہ مجھ سے

کیا تھا اسے پورا کر۔ خدایا! اگر تو اسلام کی اس مختصر سی جماعت کو ہلاک کردے گا تو اس زمین پر تیری پرستش وعبادت نہ ہوگی۔'' آپ برابر اسی طرح ہاتھ پھیلائے ہوئے باآواز بلند دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ آپ کے شانوں سے ردائے مبارک نیچے گر پڑی۔ (مسلم۔ بروایت عمر بن الخطابؓ)

اس جنگ میں خدا کی مدد سے مسلمان فتح یاب رہے، کفار ومشرکین کو منھ کی کھانی پڑی، وہ بری طرح پسپا ہوئے۔ ان کے ستر ۷۰ سردار مارے گئے۔

اس جنگ کے موقع پر آپؐ نے مسلمانوں کو جہاد کے لیے ابھارا اور انھیں اس حقیقت سے آگاہ فرمایا تھا کہ اس لڑائی کے لیے بڑھنا درحقیقت خدا کی وسیع وعریض جنت کی طرف بڑھنا ہے۔ قرآن مجید میں جنت کی وسعت کا تذکرہ انھی الفاظ میں فرمایا گیا ہے اور اہل ایمان کو اسے حاصل کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے: سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ط (الحدید:۲۱) ''بڑھو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے مانند ہے جو ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔''

حضرت عمیر بن حمامؓ کو اپنے جنتی ہونے کی خبر سن کر اتنی تاخیر بھی گوارا نہ ہوئی کہ وہ کھجوروں کو کھا کر دشمن کے مقابلہ میں نکلیں، جنت کی آرزو میں دنیا میں تھوڑی دیر کا قیام بھی بھاری معلوم ہوا، اتنی سی تاخیر کہ کھجوریں کھا سکیں انھیں ایک طویل زندگی کی طرح سخت محسوس ہوئی، بالآخر انھوں نے کھجوریں پھینک دیں اور مشرکوں پر ٹوٹ پڑے اور خدا کی راہ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔

یہاں چند روایتیں درج کی گئی ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب یقین دلوں میں گھر کر لیتا ہے تو آدمی کی کیا حالت ہوتی ہے۔ صحابۂ کرامؓ کے اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں ایمان ویقین کی مطلوبہ کیفیت حاصل تھی۔ آدمی کو یقین کی دولت حاصل ہو اور زندگی کا اصل مقصد اس کے سامنے ہو تو اس کے جذبات واحساسات عام لوگوں سے بالکل مختلف ہوجاتے ہیں جس محنت ومشقت کے کام کو لوگ بار محسوس کرتے ہیں، اسے وہ زندگی کا حاصل سمجھتا ہے اور جو عمل عام نگاہوں میں بے لذت اور خشک ہوتا ہے وہ اس کا محبوب ترین مشغلہ قرار پاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی جس چیز کو بھی اپنا مقصد اور اپنی کامیابی کا نشانہ سمجھتا ہے

اس کے لیے وہ حد درجہ حساس ہو جاتا ہے، مقصد سے شیفتگی اور والہانہ تعلق کا اظہار یوں تو علوم و فنون اور تجارت وکاروبار وغیرہ کی دنیا میں بھی ہوا ہے لیکن اس کا سب سے بڑھ کر اظہار دین و اخلاق کی دنیا میں ہوا ہے۔ جن لوگوں نے دین واخلاق کو زندگی کا مقصد قرار دیا اور خدا کے وعدہ پر ایمان لائے ان کی زندگیاں بدل کر رہ گئیں۔ خاک وخون سے بنے ہوئے انسان کسی اور دنیا کی مخلوق معلوم ہونے لگے۔ انھوں نے اپنے کردار سے دنیا کو وہ روشنی بخشی جس کی دنیا کو ہر آن ضرورت ہے۔ ان کے ایمان نے انھیں ایسا فراغ اور قلبی نشاط اور اطمینان بخشا تھا جس کے تصور سے روحیں وجد میں آجاتی ہیں۔ جنگ تبوک کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنا سارا ہی اثاثہ لا کر حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔ حضورؐ کے دریافت فرمانے پر کہ گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟ وہ کہتے ہیں ''گھر پر خدا اور رسول کو چھوڑا ہے۔'' ہمارے گھر کی آبادی مال و دولت سے نہیں اللہ اور اس کے رسول سے ہے۔ اللہ اور اس کے رسول سے کچھ بچا کر رکھنا ہمارے لیے ممکن ہی نہیں۔ جس چیز نے حضرت صدیقؓ کو اتنا اونچا اٹھایا تھا وہ ایمان کی اعلیٰ کیفیات کا شعور و احساس تھا۔ حضرت ابن عباسؓ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: مَا سبقکم ابوبکر بکثرۃ صوم ولا صلوٰۃ وَ لکن بشیٔ وقر فی قلبه ''ابوبکر نماز اور روزے کی کثرت کے سبب سے سبقت نہیں لے گئے بلکہ ایک چیز کی وجہ سے جو ان کے دل میں راسخ ہو گئی۔''

حضرت خبیبؓ کو ان کے دشمن قتل کرنے کی غرض سے حدودِ حرم سے باہر لے گئے تو انھوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ نماز سے فارغ ہو کر فرمایا: جی تو چاہتا تھا کہ دیر تک نماز پڑھوں لیکن تم سمجھتے کہ موت سے ڈر گیا۔ پھر انھوں نے یہ شعر پڑھا:

وَمَا ان ابالی حین اقتل مسلما   عَلیٰ ای شق کان فی اللّٰہ مصرعی

و ذالک فی ذات الالٰہ و ان یشا   یبارک علی اوصال شلو ممرع

''جب میں اسلام کے لیے قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھے اس کی پروا نہیں کہ میں کس پہلو قتل کیا جاتا ہوں۔ جو کچھ ہے خالصاً خدا کے لیے ہے اگر وہ چاہے گا تو ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل فرمائے گا۔''

حضرت خبیبؓ خدا کی راہ میں جان دے کر اپنے بعد آنے والوں کو منزل کا پتہ دے گئے۔ ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے کامیاب ہیں خواہ وہ حسن البنا ہوں یا عبدالقادر عودہ ہوں یا

سید قطب اور ان کے ساتھی۔ زندگی کا طالب ہر شخص ہے۔ خدا جس کو زندگی عطا کرنی چاہتا ہے اسے یوں زندگی مرحمت فرماتا ہے۔ سطحی اور پست قسم کے اغراض و مقاصد تو آدمی کو تباہ کر ڈالتے ہیں۔ ان کے پیچھے پڑ کر آدمی چاہے سب کچھ حاصل کر لے لیکن شخصیت اور عزتِ نفس نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں رہ سکتی۔ شخصیت اور کردار کے مالک تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو کسی بلند مقصد کے لیے جینے اور اس کے لیے مرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ قلعوں کو فتح کر لینا اور دشمنوں کو شکست دینا آسان ہے لیکن خواہشاتِ نفس کو زیر کرنا اور مستقل طور پر اپنے آپ کو ایک راہ پر لگا دینا بے حد مشکل کام ہے۔ لیکن یہ مشکل ان کے لیے آسان ہو جاتی ہے جو فکر بلند کے حامل اور کسی منزل کے جویا ہوتے ہیں۔ ایمان کی طاقت ابھرتی ہے تو وہ ہر چیز کو زیر کر لیتی ہے۔ آدمی اگر اس مقام کو اپنے پیشِ نظر رکھے جو انسانی سعادت کا سب سے اونچا مقام ہے تو اس سے اس کے کردار میں طاقت اور اس کی سیرت میں پختگی آسکتی ہے۔ جب ہماری نگاہ منزل کے سوا دوسری طرف بھی ہو اور ہمارا دل اصل مقصد کے علاوہ کہیں اور اٹکا ہوا ہو تو حق کی طرف ہمارا ایک قدم بھی اٹھنا مشکل ہے۔ منزل مقصود نگاہ میں ہو اور آدمی کو ایمان کی اصل کیفیت حاصل ہو تو وہ اس چیز کا آرزومند ہو جائے جس کی آرزو وہ کل مرنے کے بعد کرے گا۔ مومن کی نگاہ تو سطحی چیزوں پر نہیں ٹکتی۔ وہ ان چیزوں کو جویا ہوتی ہے جو مستقل قدر کی حامل ہوں۔

(۳) وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِيِّ قَالَ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْ لِيْ فِي الْإِسْلَامِ قَوْلاً لَّآ اَسْاَلُ عَنْهُ اَحَدًا بَعْدَكَ وَ فِيْ رِوَايَةٍ غَيْرَكَ. قَالَ: قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔ (مسلم)

ترجمہ: حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اسلام کے بارے میں آپؐ مجھے کوئی ایسی بات بتادیں کہ پھر آپؐ کے بعد اس کے متعلق کسی سے کچھ دریافت کرنے کی مجھے حاجت نہ ہو۔ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ پھر آپؐ کے سوا کسی اور سے کچھ پوچھنے کی ضرورت مجھے پیش نہ آئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اسی پر قائم رہو۔''

تشریح: حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ کا منشاء یہ تھا کہ انھیں ایسی بات بتادی جائے جو اتنی جامع اور بامعنیٰ ہو کہ وہی اسلام کا ماحصل ہو اور وہی میرے لیے زندگی کی رہ نما بن جائے۔ پھر مجھے اسلام کی حقیقت کو سمجھنے اور اس کے مزاج اور اس کی اسپرٹ کے مطابق اپنی زندگی کا رُخ

متعین کرنے اور اپنی سیرت اور کردار کی تعمیر کے سلسلے میں کسی سے مزید کچھ رہ نمائی حاصل کرنے کی کبھی کوئی ضرورت پیش نہ آئے۔

آپؐ کے ارشاد مبارک سے معلوم ہوا کہ ایمان باللہ یعنی ایک خدا پر ایمان ہی اسلام کا اصل ماحصل ہے۔ باقی جتنے عقائد واحکام کی تعلیم اسلام میں دی گئی ہے وہ درحقیقت ایک خدا پر ایمان ہی کا مقتضا ہے۔ خدا پر ایمان یعنی اس کی ربوبیت، الوہیت اور محبوبیت کے اقرار سے زندگی وہ شکل اختیار کرلیتی ہے جس سے بہتر اور جس سے حسین تر اور سکون بخش زندگی کا ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ وہی زندگی ہے جسے مومن کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس حدیث میں جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ خدا کی کتاب قرآن سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿ۚ﴾ (الاحقاف:۱۳)

''یقیناً جنھوں نے کہا، ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اس پر جمے رہے، تو انھیں نہ کوئی خوف ہوگا۔۔۔۔۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

حقیقت یہ ہے کہ زندگی جس چیز سے عبارت ہے وہ بس یہی ہے کہ انسان اپنے منبع حیات یعنی خدا سے آشنا ہو۔ اس کی اصل وابستگی خدا ہی سے ہو۔ وہی اس کا سہارا اور اس کی ساری تمناؤں کا مرکز ومحور ہو۔ وہی اس کے جذبۂ شوق کی پناہ گاہ ہو۔ اس سے ملنے کی آرزو ہی میں وہ جیتا ہو اور اسی کے لیے وہ خاک میں ملنے کی تمنا رکھتا ہو۔ اسی کی رضا وخوش نودی کی طلب اسے میدان عمل میں سرگرم رکھتی ہو۔ اسی کی عظمت اور بڑائی سے وہ دنیا کو باخبر کرنے کے لیے کوشاں ہو۔ اسی کے احکام کے نفاذ کی آرزو اسے باطل سے نبرد آزما رکھتی ہو۔ قرآن میں ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَ نَا وَ رَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِہَا وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۙ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۸﴾ (یونس:۷-۸) ''وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا ہی کی زندگی پر راضی ہوکر رہ گئے ہیں اور اسی پر وہ مطمئن ہوگئے اور وہ جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانا اس کے بدلہ میں جو وہ کماتے رہے، آگ ہے۔''

اس میں شبہ نہیں کہ لقائے رب کی تمنا مومن کے لیے حرارت حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی اس کی قوت اور اس کی زندگی کی آبرو ہے۔